یادیں

(افسانہ)

تحریر: سہیل احمد لون

بارہ برس کی سائرہ جب سکول سے گھر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سرخ گلدستہ تھا۔ سائرہ نے سکول بیگ میز پر رکھ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا جو پھولوں کو معنی خیز انداز میں گھورتی جا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ ماں کوئی سوال کرتی سائرہ نے گلدستہ ماں کی طرف بڑھا کر کہا "ہیپی ویلنٹائن"۔ سائرہ نے ماں کو بتایا کہ اس نے اپنا جیب خرچ جمع کر کے اُس کیلئے یہ گلدستہ خریدا ہے۔ ماں نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹی کا شکریہ ادا کیا اور اسے کپڑے تبدیل کرنے کا کہہ کر کھانا گرم کرنے کے بہانے باورچی خانہ میں چلی گئی تا کہ بیٹی اُس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سفید گلاب نہ دیکھ لے۔ باورچی خانے میں پہنچنے سے قبل نائلہ ملک یادوں کے آئینے میں گزرے دنوں کو دیکھنے میں مگن ہوگئی ۔ وقت اور حالات ہم سے سب کچھ چھین لیتے ہیں مگر یادیں وہ عظیم سرمایہ ہیں جنہیں کوئی چھین نہیں سکتا۔ دل کو چوٹ لگتی ہے تو اس کی کسک روح کی گہرائی تک محسوس ہوتی ہے۔ جو شعور بن کر پردہ ءذہن پہ اترتی ہیں اور لاشعور بن کر حسین یادوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یادیں بھی کتنا انمول خزانہ ہے جو آنسوؤں میں ڈھل کر روح تک کو سیراب کر دیتا ہے۔ وہ یادیں جنہیں انسان بھولنا چاہیے اور وہ کبھی انسان کے مقابل اور کبھی تعاقب میں رہیں تو بدترین عذاب کا روپ دھار لیتی ہیں لیکن غم کے معنی ہیں اتھاہ تاریک سمندر میں خوشی کا مینار۔ زندگی کی بے کیف اور انجان راہوں پر ہماری ساتھی یہ یادیں زندگی کو تپتا صحرا بنا دیتی ہیں۔ جب دیدہ گل سے شبنم ٹپکتی ہے اور زرد چاند سے برستی ہوئی ٹھنڈک ہولے ہولے روح کو سلگاتی ہے تو من کی جھیل میں یادوں کے سینکڑوں چراغ جل اٹھتے ہیں۔ کوئی دل اُس وقت تک منور نہیں ہوسکتا جب تک وہ ان جلتے چراغوں کی حدت کو برداشت نہیں کرتا۔ آنسو اور روشنی مسکراہٹ کا روپ دھار لیتے ہیں اور پھر تنہائی میں کسی کی یادکا رس گھول کر پینا کتنا دلکش اور دلنشیں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے نائلہ ملک کو تلخ یادوں کے کڑوے گھونٹ محبت کی میراث میں ملے تھے جن کو تنہائی میں پیتی اور زندگی کے قافلے میں بیٹی کے ہمراہ کسی نہ معلوم منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ بیٹی کے ہاتھوں سے اٹھنے والی گلابوں کی مہک نے نائلہ ملک کو وہ دن یاد کروا دیا جب اسے پہلی بار کسی نے گلاب خط میں لپیٹ کر کالج سے واپسی پر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ خوبرو نائلہ اس وقت تقریباً سترہ برس کی تھی اور سیکنڈ ائیر میں پڑھتی تھی۔ اس کے والد بیرون ملک ملازمت کرتے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ گھر کی معاشی حالت بڑی مستحکم تھی۔ نائلہ کی ہر خواہش کا احترام کسی شاہی خاندان کے وارثوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ ماں کے علاوہ گھر میں چچا اور اس کی فیملی تھی جن کی دو بیٹیاں تھیں۔ خط میں گلاب لپیٹ کر دینے والا نوجوان لڑکا ناصر اکثر موٹر سائیکل پر اس کا تعاقب کرتا تھا۔ ویلنٹائن ڈے پر اس نے جرات دکھائی اور اپنے دل کا حال بیان کر کے نائلہ سے جواب کا مطالبہ کیا۔ ناصر ایک عام سی شکل وصورت کا مالک 22 برس کا نوجوان تھا۔ مگر اس کی تحریر نے نائلہ کو بے حد متاثر کیا۔ چند ہی روز میں نائلہ اور ناصر محبت کی

وادی میں خوشی کے نغمے گنگنانے لگے۔سونے سے قبل روزانہ فون پر عہدوپیماں ایک معمول بن گیا تھا۔ جب گھر والوں کو شک ہوا تو لاڈ پیار میں جوان ہونے والی خودسر نائلہ اپنے چچا اور چچازادوں کو بھی خاطر میں نہ لائی۔ جب ماں نے روک ٹوک کرنا چاہی تو نائلہ نے معاملہ ناصر کو بتایا۔ دونوں بالغ تھے لہذا انہوں نے کورٹ میرج کرلی جس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ایف اے کا آخری پیپر دینے کے بعد نائلہ نے گھر بتادیا کہ اس نے شادی کرلی ہے۔جس پر گھر میں طوفان برپا ہوگیا، نائلہ نے گھر چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ ناصر نے اسے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔اس کی فیملی بھی خاصی بڑی تھی سب نے کھل کر اس کے فیصلے کی مخالفت کی۔ ناصر کے باپ نے معاملے کی سنگینی سمجھ کر دانش مندی کا ثبوت دیا اور نائلہ کو قبول کرلیا۔اس فیصلے کے آگے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہاں آ کر نائلہ کو پتہ چلا کہ ناصر کوئی کام کاج نہیں کرتا، بلکہ ہیروئن کے نشے کا عادی بھی تھا۔ باپ کے پیسوں سے زہر خرید کر اپنی رگوں میں اتارتے ہوئے اسے تین برس ہوگئے تھے۔نائلہ کے باپ کو بیرون ملک جب یہ پتہ چلا کہ اس کی اکلوتی بیٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اس کا ذمہ دار اس نے اپنی بیوی کو ٹھہرایا۔جس کی سزا اُسے طلاق کی صورت بھگتنا پڑی۔وہ بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے اور پچاس برس کی عمر میں طلاق یافتہ ہونے کا غم برداشت نہ کرسکی اور دل کا دورہ پڑنے سے خالق حقیقی سے جاملی۔ نائلہ کا باپ پاکستان واپس آیا تو گھر میں نہ بیٹی تھی اور نہ ہی بیوی۔ بھائی سمیت اہل محلّہ کے طعنے سننے کے بعد اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور وہ تمام دنیاوی فکروں سے آزاد ہوگیا۔نائلہ کو مرے ماں، باپ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔شادی کے پہلے پانچ برسوں میں دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ناصر نے کبھی کام نہ کیا اور اس کی بیوی اور بچوں کا خرچہ اس کا باپ ہی اٹھاتا تھا جس پر گھر کے باقی افراد بہت ناخوش تھی، نشے کی عادت جلد ہی ناصر کو لحد تک لے گئی۔نائلہ کے لیے بچوں اور خسر کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا رشتہ باقی نہ رہا جس سے اپنائیت کا دعوی کرسکتی۔ حالات کا شکار ہونے والی نائلہ پر غموں کا پہاڑ اس وقت ٹوٹا جب اس کو یہ اطلاع ملی کہ اس کے خسر اور اس کے دونوں بیٹے داتا دربار میں ہونے والے خودکش حملے میں جان بحق ہوگئے ہیں۔ چند روز بعد اس کے لیے سسرال کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو لیکر اپنے چچا کے پاس جائیداد میں حصہ لینے کے لیے گئی جہاں سے اسے دھتکار کے علاوہ کچھ نہ ملا۔حکومت کے اعلان کے باوجود داتا دربار میں ہلاک شدگان کے لواحقین کو کوئی مالی امداد نہ ملی۔نائلہ نے بھی چند روز سرکاری دفاتر کے دھکے کھائے پھر حالات اور مقدر کی گرم جنگ میں اس کا مقدر ہار گیا۔اس نے کرائے کا ایک چھوٹا سا مکان لیا، ایسے معاشرے میں جہاں اکیلی عورت باہر نکلے تو اسے کئی خونخوار بھیڑیوں کی للچائی ہوئی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے صبح ایک پرائیویٹ سکول اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا رہی ہے، اس کی سوچ کا محور اب صرف اس کی بیٹی سائرہ ہے۔حالات کی ستم ظریفی میں پلنے والی سائرہ کی ذہنی عمر بلوغت کی حدیں کب کی پار کرچکی ہے۔وہ یہ جانتی ہے کہ اس ماں کو تحفہ دینے والا کوئی نہیں، شاید اسی وجہ سے اس نے اپنی زندگی میں پہلا ویلنٹائن اپنی ماں کو بنایا۔ کافی دیر سے چولہے پر پڑا سالن گرم ہونے کے بعد جلنا شروع ہوگیا۔جس کا احساس سوچ کے سمندر میں غرقاب نائلہ ملک کو تو نہ ہوا مگر اس کی بیٹی سائرہ تک جلنے کی بو پہنچ گئی۔امی سالن جل چکا ہے سائرہ کی آواز سے نائلہ چونک گئی۔مگر سالن تو دوبارہ بھی بنایا جاسکتا ہے مگر کسی کی قسمت جل جائے تو صرف صبر سمندر ہی پینا پڑتا ہے۔یادوں کے قافلے کتنی تیزی سے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔لمحہ بھر کے لیے ہماری زندگی مچلتی ہے اور پھر اک سلگتی ہوئی کہانی

بن جاتی ہے اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ لمحے یادوں میں کس قدر جلد تبدیل ہوتے ہیں۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

15-02-2014.